قومی آواز

نام کتاب : قومی آواز: جدید اردو صحافت کا معمار
مصنف : سہیل انجم
اشاعت : ۲۰۲۲ء

حال ہی میں ایک روز سہیل انجم صاحب آئے اور ایک خوشگوار اور روح افزا تحفہ عنایت کیا۔ اس کے ساتھ ہی یادوں کے محافظ خانے کے دریچے کھلنے لگے اور ہر طرف مسکراتے ہوئے مانوس چہرے دعوتِ نظارہ دینے لگے۔ میری عمیق تنہائی میں اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ ان چہروں کا شمار کہاں سے شروع کروں، کیوں نہ اس کا آغاز سہیل انجم ہی سے کروں، ان کے علاوہ فرحت احساس، عبدالحئ، منصور آغا کے بارے میں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ جولانیِ حیات کا ثبوت دے رہے ہیں۔ عشرت علی صدیقی، موہن چراغ، نیاز اعظمی (بمبئ)، سید محمد رافع اور شاہین محسن (پٹنہ) کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ اس دارِفانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جن کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم بڑے لائق و فائق، بیحد خوش مزاج اور خوشگفتار، صحافی اور دوست تھے۔ نیاز اعظمی (بمبئ) کلکتہ میں میرے ساتھ عصرِ جدید میں کام کر چکے تھے، میں انھیں عزیز بھائی کی طرح سمجھتا تھا۔ وہ انقلاب میں نیوز ریڈر ہو گئے تھے میں جب بمبئ جاتا تو ایک دن ان کے ساتھ گزارتا اور ایک دن ایک اور اتنے ہی عزیز محمود ایوبی کے ساتھ جو اردو بلٹز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، وہ بھی میرے ساتھ کلکتہ میں عصر جدید میں کام کر چکے تھے۔ سید محمد رافع بھی کلکتہ میں میرے ساتھ عصر جدید میں کام کر چکے تھے۔

اور کس کس کا ذکر کروں 'قومی آواز' لکھنؤ میں بڑے لائق صحافی عثمانی غنی، حسن واصف عثمانی جو بلا پائپ کے نہیں نظر آئے، اختر یونس قدوائی جو شیروانی کے بغیر نہیں دیکھے گئے، لیکن ان کی شیروانی بند اور بٹن کی قید سے بالکل آزاد ہوا کرتی۔ افسوس کہ اتنے لائق صحافیوں کو صدیقی صاحب کی انانیت کے سائے میں سر اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ غالباً ۱۹۷۸ء میں قومی آواز لکھنؤ کے دفتر میں صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس تعارفی ملاقات میں ہی ان کی مزاجی کیفیت کا کچھ اندازہ مجھے ہو گیا تھا۔ اس کی تصدیق زیرِ نظر تصنیف میں شامل قیصر تمکین کے ایک جملے سے ہوتی ہے ''عشرت صاحب کا خیال تھا کہ دنیا کی تخلیق ہندوستان کو مرکز کائنات بنانے کے لیے ہوئی تھی اور اس مرکز کائنات کا مرکز قومی آواز تھا، جس کے مرکز وہ خود تھے۔''

صدیقی صاحب کے متعلق مجھے ایک اور تجربہ ہوا جس کی تصدیق قیصر تمکین کے مضمون میں اس عبارت سے ہوتی ہے: ''عشرت صاحب اپنی اس کٹر اصول پرستی کی بنا پر تا حال کسی غیر ملکی دورے (مثلاً کلچرل وفود یا صحافتی کانفرنس وغیرہ قسم کی چیز) سے مستفید نہیں ہو سکے ہیں۔'' ایک واقعہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اخبار نویسوں کا ایک گروپ

جس میں کئی مختلف زبانوں کے صحافی شامل تھے ایک مہینے کے دورے پر امریکہ جانے والا تھا۔ اس میں شمولیت کے لیے اردو صحافی کے طور پر میں نے موہن چراغی کا نام تجویز کیا جو کافی ردوقدح کے بعد منظور ہو گیا۔ اس وقت موہن چراغی سرینگر میں ہیرالڈ گروپ کے نامہ نگار تھے لیکن میں انھیں صدیقی صاحب کے جانشین کی نظر سے دیکھتا تھا، جو کہ درست ثابت ہوا۔ صدیقی صاحب میری اس حرکت پر بہت چراغ پا ہوئے اور لکھنؤ سے ٹیلی فون پر تلخ کلامی کی۔ دہلی سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے کے بعد صدیقی صاحب ایک روز میرے دفتر میں امریکن سینٹر آئے۔ غالباً میرے کمرے میں آنے کے بعد انھیں یقین ہو گیا ہوگا کہ میں حکومت امریکہ کا واقعی ملازم تھا کوئی ایجنٹ نہیں تھا۔

اردو اخباروں کے مسلمان مالکوں کے متعلق میرے تجربات بہت تلخ ہیں۔ اس کی تائید بھی قیصر تمکین کی اس عبارت سے ہو جاتی ہے: ''حیات اللہ صاحب کی شخصیت کی تمام خوبیوں کے باوجود ان کا ایک پہلو ایسا ہے جو انتہائی افسوسناک ہے۔ وہ صحافیوں کی اضافۂ تنخواہ یا بہتر شرائط ملازمت کی تحریک کو اسی طرح ملک وقوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے جیسے انگلستان کے ٹوری پارٹی کے سامراج پسند۔ اس سلسلے میں انتہائی شرمناک ان کی وہ شہادت تھی جو انھوں نے پریس کمیشن کے اجرت بورڈ کے سامنے دی اور کہا کہ اردو صحافیوں کے لیے دس روپیہ ماہوار تنخواہ ضرورت سے زیادہ کافی ہے۔'' (یہ زمانہ ۱۹۵۸ء کا تھا)

قومی آواز کی اشاعتیں

آزادی سے قبل لکھنؤ میں قومی آواز کی اشاعت کے آغاز اور آزادی کے بہت برسوں بعد چار دیگر شہروں سے قومی آواز کی اشاعت کے تذکرے سے پہلے دو خاص باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

اول یہ کہ ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کے تین اخبارات نیشنل ہیرالڈ (انگریزی) نوجیون (ہندی) اور قومی آواز (اردو) تھے اور ایسوسی ایٹیڈ جنرلس نہرو گھرانے کی ملکیت میں تھا۔ آزادی کے بعد تقریباً چالیس سال تک ملک پر بلا شرکتِ غیرے نہرو گھرانے کی حکمرانی تھی ایسے میں سارے سرکاری اور غیر سرکاری اشہارات وسیع پیمانے پر ان اخباروں کو دستیاب تھے اور اشتہارات ہی اخباری اقتصادیات میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ۱۹۴۵ء میں جب قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی، اس زمانے میں شمالی ہند میں اردو اخبارات کا مسلمان قاری بڑی حد تک مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر تھا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کے پاس اس کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ الجمعیت اور چند دیگر اردو ہفت روزہ اخباروں کا عام مسلمان قاری پر کوئی اثر نہیں تھا۔ ایسے میں کانگریس پارٹی کو ایک اردو ترجمان کی سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ قومی آواز کے لیے میدان خالی تھا اور ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کا بنیادی ڈھانچہ موجود تھا۔ ان حالات میں لکھنؤ میں قومی آواز کا آفتاب طلوع ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں تنویر اور کانپور میں سیاست جدید کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر اردو اخبار نہیں تھا۔

مسلم قاری بھی بڑے ذہنی آزار اور تذبذب کا شکار تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات ایک کابوس کی طرح مسلم ذہن پر سوار تھے۔ جلد ہی ملک کی آزادی کے ساتھ ہی اس کے دولخت ہونے کا المیہ وقوع پذیر ہوا۔ اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مہاجرت کے عذاب سے دوچار ہوا، کچھ تو فسادات کی زد میں آ کر مجبور ہوئے، دانشور طبقہ کو ایک نئی مملکت میں بڑے مواقع کی فراوانی کی کشش محسوس ہوئی۔ شمالی ہند میں بڑے مسلمان زمینداروں اور امراء کی بڑی تعداد تھی اسے کانگریس کی خاتمہ زمینداری کی اعلانیہ پالیسی نے حواس باختہ کر دیا تھا اور بہت جلد ۱۹۴۹ء میں سب سے پہلے یوپی میں خاتمہ زمینداری کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ ان گنت خوشحال مسلمان راتوں رات مفلوک الحال اور بے یار و مددگار ہو گئے۔ ایسے میں ایک مستحکم اور سیکڑوں سال میں تربیت پائی ہوئی تہذیب کے تار و بود بکھر گئے۔ جو نوحہ خواں بچ رہے جیسے کہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی عتیق الرحمٰن وغیرہ، سر بہ گریباں تھے۔ ان حالات میں قومی آواز اظہار کا ایک ذریعہ بنا۔

اردو اخباروں کا مسلمان قاری اس وقت سخت ذہنی، روحانی اور جسمانی آزار و عذاب سے گزر رہا تھا۔ ''نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن، نہ راہ بازگردیدن'' کی کیفیت سے دوچار تھا۔ قیادت منتشر اور منقسم ہو کر ناپید ہو چکی تھی۔ ان تاریک راہوں میں اس کو راستے کون دکھائے۔ ایسے میں قومی آواز کا ظہور روشنی کی ایک مدھم سی لکیر ثابت ہوا۔ لیکن اس روشنی کو دہلی تک پھیلانا بھی وقت کی ضرورت بنتا گیا۔

بات دہلی ایڈیشن کی

چنانچہ ایک عرصہ دراز کے بعد سہی لیکن وہ چراغ بہر حال روشن ہو گیا۔ اس وقت دہلی سے کئی اردو اخبارات شائع ہو رہے تھے لیکن میری مراد ان اخباروں سے ہے جن کا مخاطب مسلم قاری تھا۔ الجمعیۃ تقریباً جمعیت علماء کا ترجمان ہو کر رہ گیا تھا۔ دعوت کی کم و بیش جماعت اسلامی سے وابستگی کے بعد زیادہ دور تک نہیں جاتا تھا۔ بقیہ دو تین اخبارات جو تھے وہ غیر ضروری مبالغہ آرائی اور ایک خاص ذہنی فضا کی تسکین کا سامان فراہم کر کے سرکولیشن بڑھانے سے سروکار رکھتے تھے۔ کسی طرح کی رہنمائی کا تصور انھیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔

ایسے میں دیر سے سہی لیکن ایک معیاری اور متوازن صحافت کے طور پر 'قومی آواز' کا نمودار ہونا اردو قاری کے لیے یقیناً ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک بھرپور اخبار تھا اور کئی طرح کی خوش قسمتی کی ہما اس پر سایہ فگن تھی۔ ہیرالڈ ہاؤس میں انفراسٹرکچر یعنی بنیادی سہولتیں موجود تھیں۔ لکھنؤ کی طرح دہلی میں بڑے لائق و فائق صحافیوں کی خدمات حاصل تھیں۔ نہرو گھرانے کا اثر ہلکا ہوتا جا رہا تھا تاہم بڑی حد تک قائم تھا۔ ایک بار میں نے موہن چراغی سے کہا کہ بڑے بڑے انگریزی اخباروں کو بھی اپنی پبلسٹی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ کبھی کبھی اس مقصد سے مہمیں بھی چلاتے ہیں لیکن اردو اخباروں نے کبھی اس کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد دہلی کے مختلف علاقوں میں ہمارے اوکھلا میں بھی قومی آواز کی ہورڈنگ جا بجا نظر آئی۔

لیکن افسوس ''ایں شعلۂ مستعجل بود'' جس کے کئی اسباب ہوئے۔ دہلی میں ہندوستان ٹائمز، انڈین ایکسپریس، ٹائمز آف انڈیا، اسٹیسٹمین اور پیٹریاٹ جیسے انگریزی اخباروں کے مقابلے میں کھڑا ہونا نیشنل ہیرالڈ کے لیے ناممکن تھا۔ اسی طرح ہندوستان، نو بھارت ٹائمز اور کئی دوسرے ہندی اخباروں کے مقابلے میں نوجیون کا ٹکنا محال تھا۔ اس کے برعکس قومی آواز اقتصادی طور پر مستحکم اور خود کفیل تھا لیکن افسوس کہ اس کی کمائی پر ان دونوں ہم عصروں کی پرورش ہوتی رہی اور قومی آواز کی نبض بالآخر ڈوب گئی۔

ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہوئی۔ پریس کمیشن کے اجرتی بورڈ نے پچھاوت کمیشن کی تجویز کے مطابق کاتبوں کو صحافی تسلیم کرلیا تھا، چنانچہ انھیں سب ایڈیٹروں کے مساوی درجہ اور تنخواہ کا مستحق قرار دیا تھا۔ اس وقت تک اردو اخباروں میں کمپیوٹر اور کمپوزنگ کا آغاز نہیں ہوا تھا، مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت اردو اخباروں کی پرنٹنگ کا کون سا طریقہ رائج تھا لیکن بہرحال سست رفتار تھا اور قومی آواز جیسے اخبار کی بروقت کاپی تیار کرنے کے لیے کاتبوں کی ایک بڑی ٹیم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب اجرتی بورڈ کا فیصلہ کاتبوں کے حق میں آیا تو ان کو بقایا واجبات کے طور پر بھاری رقوم ادا کی گئیں غالباً اس وقت کاتبوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ تھی۔ وہ تو مالا مال ہوگئے لیکن قومی آواز کا بھٹہ بیٹھ گیا۔ جیسے سونے کے انڈے روزانہ دینے والی مرغی کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس کو ذبح کرکے سارے سونے کے انڈے ایک ہی دن میں نکال لوں، افسوس صد افسوس!

پٹنہ ایڈیشن

قومی آواز کا پٹنہ ایڈیشن جب شروع ہوا اس وقت وہاں ساتھی، صدائے عام اور سنگم نکل رہے تھے جو کانگریسی اور غیر کانگریسی مختلف سیاسی نظریات کے حامل تھے اور اپنی جگہ پر ان کی حیثیت مستحکم تھی۔ لیکن ایسوسی ایٹیڈ جرنلس جیسے وسائل رکھنے والے کسی ادارے کے لیے پٹنہ جیسے شہر میں انفراسٹرکچر کھڑا کرنا مثلاً اخبار کے دفتر اور پریس وغیرہ کے لیے جگہ حاصل کرنا کوئی بہت بڑی بات نہیں تھی اور وہاں اچھے تجربہ کار صحافی بھی موجود تھے جو کہ دس بارہ سال تک وہاں قومی آواز کی اشاعت جاری رہنے ہی سے ظاہر ہے لیکن غالباً دہلی ہی جیسے ناسازگار حالات نے وہاں بھی اس کا گلا گھونٹ دیا۔

بمبئی ایڈیشن

قومی آواز کا بمبئی ایڈیشن بہت کم عمر ثابت ہوا۔ اس کے اسباب شروع سے ہی نمایاں تھے۔ اس کو اپنے دفتر کے لیے اردو خواں آبادی کے قرب و جوار میں کہیں جگہ نہیں ملی چنانچہ اسٹاف کے لیے بہت دور آنا جانا مشکل تھا۔ آج جس طرح بڑی بڑی کمپنیاں اپنے اسٹاف کی آمد و رفت کے لیے کیب کی سہولت فراہم کرتی ہیں اس کا اس وقت چلن نہیں تھا، اخبار کی تقسیم کے معاملے میں ہاکروں کا بھی مسئلہ رہا ہوگا۔ مزید براں اس کو انقلاب اور اردو ٹائمز جیسے مقبول اخبارات سے مسابقت کا بھی سامنا رہا ہوگا۔ ایسوسی ایٹیڈ جرنلس کا انتظامیہ ان مسائل میں سے کسی کا حل بھی نکالنے

میں ناکام ہوگیا۔ چنانچہ اس نے یہ دکان بند کر کے ہاتھ جھاڑ لیے۔ اس سلسلہ میں خلیل زاہد کا تکلیف دہ تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ بمبئی کے اچھے صحافیوں میں شمار کیے جاتے تھے، انھیں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں جگہ مل گئی تو وہ دہلی آ گئے لیکن اس کے بعد جلد ہی بمبئی سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے کی بات ہوئی تو انھوں نے نے لپک کر اس موقع کو پکڑا۔ شاید بمبئی کی کشش کو اس میں دخل رہا ہو۔ اخبار جلد ہی بند ہوگیا پھر خلیل زاہد کہاں گئے کیا ہوئے۔ میں بمبئی جاتا آتا رہا لیکن ان کا کوئی ذکر کبھی نہیں سنا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت بھی گئی۔ افسوس ہوا۔

سرینگر ایڈیشن

اس کو بالکل حادثہ ہی کہہ لیجیے کہ ۱۹۸۹ء کے اطراف میں جب سرینگر سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہوئی تو وہی زمانہ تھا کشمیر میں اس پرتشدد تحریک کے آغاز کا جس کا سلسلہ رک رک کر آج تک جاری ہے۔ اس زمانے میں مسٹر جگموہن جموں و کشمیر کے گورنر تھے اور فاروق عبداللہ وزیر اعلیٰ تھے۔ یاد نہیں اس وقت ایسی کیا انتخابی بے ضابطگی ہوئی یا کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ ایک پرتشدد تحریک پھوٹ پڑی۔

کشمیر سے نہ معلوم کتنے اردو اخبارات نکل رہے تھے جن میں سرینگر ٹائمز اور 'آفتاب' مقبول اور نمایاں تھے۔ پنڈت وطل کا خدمت بھی نکل رہا تھا جو کانگریس کا ترجمان تو نہیں تھا لیکن کانگریس پارٹی کے نظریات پر اس کی سیاسی پالیسی مبنی تھی۔

موہن چراغی لکھتے ہیں کہ سرینگر سے قومی آواز کی اشاعت شروع ہونے سے پہلے ہی سرینگر ٹائمز کے مالک اور ایڈیٹر صوفی غلام محمد نے اس کی پُر زور مخالفت شروع کر دی تھی۔ دراصل وہ قومی آواز کو اپنے اخبار کے لیے ایک بڑا چیلنج سمجھتے تھے۔ ان کا یہ اندیشہ درست بھی ثابت ہوا۔ موہن چراغی لکھتے ہیں کہ قومی آواز کی اشاعت پانچ سو سے شروع ہوئی اور بہت جلد دس ہزار تک پہنچ گئی جو یقیناً بہت بڑی بات تھی۔ ایسے میں وہ پُرتشدد تحریک جو تقریباً اسی اثناء میں شروع ہوئی تھی، قومی آواز کے مخالفوں کے لیے ایک سنہرہ موقع ثابت ہوئی اور عین ممکن ہے انھوں نے کچھ تخریب پسندوں کا رخ قومی آواز کی طرف موڑ دیا ہو، چنانچہ اخبار کے اندر اور باہر بغاوتیں شروع ہوگئیں اور قومی آواز کی آواز بند ہوگئی۔ اللہ اللہ خیر صلّی۔

قومی آواز اپنے ہر ایڈیشن میں ایک مکمل اور متوازن اخبار تھا۔ ہر طرح کے قاری کی پسند کا کچھ نہ کچھ مواد اس میں موجود ہوتا۔ وہ کانگریس کی پالیسیوں کا علمبردار تھا۔ کانگریس پارٹی کی پالیسیاں مسائل حاضرہ کے متعلق دو ٹوک اور صاف ہوتی تھیں اس لیے قومی آواز کی کسی تحریر میں اس کا واضح طور پر اظہار آسان تھا۔ اگر کبھی توازن میں فرق آتا تو وہ ایڈیٹر صاحب کے اپنے طریقہ اظہار ہی کی وجہ سے۔ ایک بااصول صحافی میں اَنا کا عنصر ضرور ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس میں بوقت ضرور ''نا'' کہنے کی جسارت پیدا ہوتی ہے، لیکن ''انا'' اور ''انانیت'' کے درمیان ایک باریک سے خطِ فاصل ہے جسے تحریروں میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ عشرت علی صدیقی اور موہن چراغی کی تحریروں میں

کبھی کبھی اس کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

قومی آواز دہلی کے ہفتہ وار ضمیمہ میں فرحت احساس اور ریگولر ایڈیشن کے کالموں میں موہن چراغی میرے مضامین کو جگہ دیتے رہے اس کے لیے میں ان دوستوں کا سپاس گزار ہوں۔ سہیل انجم کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب عطا کر کے مجھے اس اظہارِ تشکر کا موقع دیا۔

یہ کتاب ابتداً تعارفی مضامین کے علاوہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ تعارفی مضامین پروفیسر اختر الواسع، جلال الدین اسلم اور ڈاکٹر سہیل وحید کے ہیں۔ اس کے بعد مصنف نے قومی آواز نئی دہلی میں اپنے رفقائے کار کا نام بہ نام تذکرہ کیا ہے۔ ان یادوں کے ذریعہ ناموں کو زندہ رکھنے کا ایک قابل تقلید عمدہ طریقہ ہے۔ اسی باب میں موہن چراغی اور اشہر ہاشمی کے مضامین ہیں۔

دوسرا باب قومی آواز کے لکھنؤ ایڈیشن سے متعلق ہے جس میں عشرت علی صدیقی، عابد سہیل، قیصر تمکین اور قطب اللہ کے مضامین شامل ہیں۔

تیسرا باب قومی آواز کے بمبئی، پٹنہ اور سرینگر ایڈیشنوں کے متعلق ہے اس میں سعید حمید، ریحان غنی، اور موہن چراغی کی تحریریں شامل ہیں۔

چوتھا باب قومی آواز کے چند اہم مدیر اور صحافیوں کے تذکروں پر مشتمل ہے، اس باب میں دس صحافیوں کے متعلق مختلف اصحابِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔

آخر میں پس نوشت کے زیر عنوان قومی آواز کی ویب سائٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے سہیل انجم سنڈے نیشنل ہیرالڈ اور نوجیون ویکلی کے اجرا کی خبر دیتے ہیں۔ دیکھنا ہے کہ ہفتہ وار قومی آواز کے اجراء کی بشارت کب سناتے ہیں، جس کی ادارت کے لیے دو درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور دیدہ ور صحافی سہیل انجم کی شخصیت موزوں ترین ہوگی۔ دراصل کانگریس کے سیاسی زوال اور کئی اردو روزناموں کی موجودگی کے باوجود کانگریس کو اردو قاری سے مخاطبت کے لیے ایک ترجمان کی ضرورت ہے۔

رضوان اللہ